ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.3 (2026)
(July to September)

"ہندوستان سے ایک خط" تہذیبی المیہ کی بازگشت

"Hindostan se aik Khat" Echoes of a Civilizational Tragedy

ڈاکٹر اسد عباس
لیکچرار، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
لیکچرار، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Dr. Asad Abbas
Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha
Dr. Muhammad Kamran Shahzad
Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha

Abstract:
This research paper is an attempt to critically examine Ahmad Nadeem Qasmi's short story as a profound reflection of the civilizational tragedy caused by the partition of the Indian subcontinent. The study explores how the story transcends political boundaries to portray the emotional, cultural and psychological disintegration experienced by individuals and communities divided by history. Through the symbolic motif of the letter, Qasmi reconstructs a shared cultural memory that survives despite geographical separation and ideological conflict. The paper investigates the themes of Nostalgia, Displacement, fractured identity, and the enduring bonds of a common Indo-Muslim cultural heritage. It further analyzes Qasmi's artistic techniques which effectively communicate the pain of separation and the resilience of human relationships. Ultimately, the study establishes that the story remains a timeless literary testimony to the human cost of political divisions and underscores the importance of cultural continuity, mutual understanding, and shared historical consciousness in contemporary discourse.

Key words: Ahmad Nadeem Qasmi, civilizational Tragedy, cultural memory, Nostalgia, Urdu fiction, Identity, South Asian Literature.

ہندوستان کے وجود سے جب پاکستان اور بنگلہ دیش نے جنم لیا تو ساتھ ہی کئی خاندانوں کا شجرہ بھی تقسیم ہوا۔ تقسیم کے یہ اثرات انسانی زندگی کے لیے کئی مسائل کا آخری حل تھے تو کئی طرح کے نقصانات کا موجب بھی۔ کوئی آنکھوں دیکھے زمین اور آسمان کے بیچ ہی بچھڑ گیا تو کوئی ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور دائمی جدائی دے گیا۔ فسادات سے حاصل ہونی والی اذیتوں نے ایک لگے بندھے نظام اور انسانی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ خواتین نے بھی دونوں ملکوں میں ایسے ایسے صدمات برداشات کیے ہیں جن کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ یہ تکلیف دہ واقعات نہ صرف ایک فرد کی ذات پر اثر انداز ہوئے بلکہ ان کے اثرات خاندانوں کی کلیت اور سالمیت پر بھی اثر انداز ہوئے۔ تقسیم کے اثرات فوری اور ہنگامی نوعیت کے تو تھے ہی لیکن کم سے کم دو نسلوں تک اس کے اثرات پھیلے اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ذہنوں پر اس خونی منظر کے بہت سے عکس ہیں، بہت سے رشتوں کے جدا ہونے کے دکھ،

دوستوں اور خاندانوں کا تقسیم ہو جانے کا دکھ، اور پھر سرحدی پابندیوں کے باعث ان رشتوں کے درمیان سہولیات کا فقدان یہ سب مناظر آج بھی ایسے خاندانوں کے لیے وجہ تکلیف ہیں جو براہ راست ہجرت کے تجربے سے گزرے۔ اس ہجرت میں ایسے گھر بھی تھے جن میں سے آدھے افراد ہجرت پر نکل کھڑے ہوئے اور آدھے وہیں رہ گئے۔ آج وہ لوگ ڈاک، ٹیلی فون، اور ویزوں کے چکروں میں ایک دوسرے کی خیر خبر کو ترستے ہیں۔ وقتی طور پر ہونے والے ہر قسم کے نقصان کو برداشت کر کے زندگی کو پھر سے نئے عہد کے ساتھ جینے والے ان خاندانوں کے اور بھی دکھ ہیں۔ جس کی آنچ میں یہ لوگ ہمہ وقت جل رہے ہیں۔

انتظار حسین نے ماضی سے بہت سی یادوں کو لے کر ایک ایسا منظر نامہ تیار کیا ہے جس میں ماضی صرف ماضی پرستی نہیں رہتی اور حال کا نام صرف موجودہ دور میں زندہ رہنا نہیں، اور نہ یہ افسانے ماضی اور حال کے درمیانی فاصلے کو پُر کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں بلکہ یہ افسانے ایک مشترکہ تہذیب کی بازیافت ہیں ایک غیر محسوس سی دلنشیں خوشبو ہے جس کا تعقب ہے۔ ایک مشترک اور شاندار شہر بے مثال کی تعزیت ہے جس میں بکھرے ہوئے مناظر کے ساتھ وہ خود بھی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اس منظر میں بہت سارے لوگوں کو شامل کرتے چلے جاتے ہیں گیارہویں شریف کا ذکر ہے تو دوسری طرف محرم کی عزاداری ہے۔ کہیں نیاز دی جارہی ہے تو کہیں عاشورہ کی سہ پہر کو تسبیاں پڑھی جارہی ہیں۔ وہ پرانا ہندوستان جو ان کے ذہن میں بسا ہوا ہے وہ اس کو بھلانا نہیں چاہتے بلکہ تخلیقی دنیا میں ایک نئے رنگ سے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کی روایت میں بہت سا ادب ایسا لکھا گیا جس کی اوٹ میں کسی نہ کسی ہنگامے اور فساد کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء کا منظر، پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ اور المیہ مشرقی پاکستان جس نے پہلے والے مندمل ہوتے زخموں کو دوبارہ کرید دیا۔ ہجرت کے تجربے نے بہت سارے لکھنے والوں کو ایک منفرد نوعیت کی تخلیقی قوت سے مالا مال کیا، اور ایک نیا نقطہ ارتکاز دیا۔ انتظار حسین بھی انھیں اشخاص میں شامل ہیں جنھوں نے ماضی کی بازیافت سے حال کو نئے خدوخال عطا کیے۔ "گلی کوچے"، "کنکری"، "آخری آدمی"، "شہر افسوس" اور "ہندوستان سے ایک خط" ایسے افسانے ہیں جن میں ایک ڈوبتی ہوئی آنکھ سے دو رہوتی ہوئی دنیا کے امکانات پیش کیے گئے ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ "ہندوستان سے ایک خط" ان کے افسانوی مجموعے "کچھوئے" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو اصفہان سے اٹھ کر ہندوستان میں اکبر آباد اور پھر جہان آباد منتقل ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اس خاندان کا ایک شخص میر رستم علی اپنا شجرہ سنبھال کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے جو راستے میں بٹ ماروں سے لڑتا جھگڑتا اپنی جان بھی بچالیتا ہے اور شجرہ بھی۔ یہ خاندان نجیب الطرفین سید خاندان ہے (مطلب ماں باپ دونوں کی طرف سے سید)۔ اس افسانے میں یہ سید خاندان بہت سی اقدار اور رکھ رکھاؤ کا مالک دکھایا گیا ہے۔ یعنی خاندان کا پہلا شخص جو گھر سے باہر کسی اور شہر گیا وہ "پیارے میاں" ہیں جو پھوپھی اماں کے لاڈلے بیٹے تھے خاندان کا یہ پہلا شخص ہے جس نے بائیسکوپ دیکھا ایک فلم دیکھنے پر مادھوری کے دیوانے ہو گئے پھر "بمبئی کی بلی" دیکھ کر سلوچنا پر مرمٹے۔ مزاج میں آوارگی پیدا ہو گئی اور گھر سے اماں کی سونے کی بالیاں چرا کر بمبئی پہنچ گئے۔ "پیارے میاں" کی اس حرکت پر میاں جانی نے کہلا بھیجا کہ اب عمر بھر ادھر رخ نہ کرنا اور پیارے میاں عمر بھر نہ آئے، اپنی والدہ کی وفات پر آئے اور وہ بھی باہر باہر سے واپس لوٹ گئے، کیوں کہ میاں جانی کی اجازت نہ تھی، اور میاں جانی بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود کسی بزرگ کی بات کا اس قدر پاس تھا کہ وہ واپس لوٹ گئے، اس سے بڑھ کر احترام کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ "پیارے میاں" خاندان کے پہلے شخص تھے جو ۴۷ء کے فسادات میں موت کی بھینٹ چڑھے۔ اس خاندان کی اقدار کا یہ

عالم ہے کہ مذہبی شدت پسندی نہ ہے بلکہ وہ باہمی بھائی چارے کی فضا میں رہ رہے ہیں۔ ایک موقع پر کہانی کا راوی چچا قربان علی کہتا ہے کہ:۔

> "سو اے فرزند! سن کہ ہم نجیب الطرفین سید ہیں۔ حضرت امام موسیٰ کاظم سے ہمارا سلسلہ نسب جا ملتا ہے، مگر الحمدللہ کہ ہم رافضی نہیں ہیں۔ صحیح العقیدہ حنفی مسلمان ہیں۔ اصحابِ کبار کو مانتے ہیں اور اہلِ بیت سے محبت رکھتے ہیں۔ میاں جانی کا طریق چلا آتا تھا کہ عاشور کے دن روزہ رکھتے اور دن بھر مصلے پر بیٹھے رہتے ہمارے گھر میں ایک تسبیح تھی کہ عاشور کے دن عصر کے ہنگام سرخ ہو جایا کرتی تھی۔ میاں جانی بتاتے تھے کہ یہ خاص اسی مقام کی مٹی کے دانے ہیں جہاں ہمارے جدِ امجد سیدنا امام حسین علیہ الصلوۃ والسلام گھوڑے سے فرشِ زمین پر آئے تھے۔"(۱)

یعنی اس خاندان میں یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید تو ہیں مگر ان میں مذہب یا عقیدہ کی بدولت شدت نہیں بلکہ گیارہویں شریف کا ختم بھی ہے اور محرم پر عزاداری بھی۔ رشتہ داری میں بھی شعیہ سنی دونوں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود عمر کے لحاظ سے بڑے اور چھوٹے کا احترام موجود ہے۔ یہ خاندان پانچ ممالک میں تقسیم ہوا ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، بھوپال، اور بنگلہ دیش ۔ تقسیم کے وقت اس خاندان کے کچھ افراد فسادات کی نظر ہوئے بچ جانے والوں میں پاکستان پہنچ گئے جس میں کراچی کا ذکر آتا ہے اور پھر سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت بنگلہ دیش میں کچھ لوگ چلے گئے یوں اس خاندان کے افراد کی قبریں پانچ ممالک میں ہیں اور یاد کرنے والا ایک شخص جو افسانے کے مرکزی کردار "عمران میاں" کا چچا ہے جو افسانے کے آخر میں اپنا نام قربان علی بتاتا ہے۔ افسانہ واقعاتی نویت کا ہے یعنی ایک شخص جس کا نام قربان علی ہے اپنے بھتیجے عمران میاں کو خط لکھ کر اپنے حالات بتاتا ہے اور بے چین ہے کہ بھتیجے کی طرف سے کچھ خیر خبر کی اطلاع ملے۔ افسانے میں پہلی اذیت جو دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے خط کا جواب نہ آنا، یعنی پاکستان سے عمران میاں کے خط کا شدت سے انتظار ہے اس کے بوڑھے چچا قربان علی کو۔

اس افسانہ میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے وہ مکتوباتی افسانہ کی تکنیک ہے اس تکنیک کی روایت کے بارے میں بات کریں تو اس کا آغاز راشد الخیری کا افسانہ "بڑی بہن کا خط" کے نام سے ملتا ہے۔ اس تکنیک میں افسانے کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے افسانے کو ایک خط میں یا زیادہ خطوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ کہانی اس نوعیت کی ہے کہ جس کے بیان کے لیے موضوع ترین تکنیک مکتوباتی افسانہ ہی ہے کیوں کہ ایک خاندان کا بزرگ اپنے گھر کے حالات، اپنے خاندان کے ایک شخص سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں کر رہا ہے۔ خاندان کا بزرگ قربان علی ہے اور خط اپنے بھتیجے عمران میاں کو لکھا جا رہا ہے۔ اس تکنیک کی ایک سہولت یہ ہے کہ خاندان کے دکھ سکھ راہ رسم اور اقدار پر باآسانی بات رازدارانہ انداز میں اعتماد کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے کئی ایسے پہلو ہوتے ہیں جو بظاہر سب کے سامنے بیان نہیں کیے جا سکتے۔ بہن بھائیوں کی باتیں، بچوں کی باتیں، رشتوں کی باتیں، بہنوں کی باتیں یہ تمام معاملات کچھ ایک ملک میں رہ گئے کچھ دوسرے ملک میں جا بسے اس کے اظہار کے لیے انتظار حسین نے مکتوباتی افسانہ کی تکنیک استعمال کی۔

یہ تکنیک راشد الخیری کے بعد سجاد حیدر یلدرم کے ہاں "صحبتِ ناجنس" میں بھی نظر آتی ہے۔ دو سہلیوں عذرا اور سلما کی خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ پھر سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ایک خط" جو کہ ان کے افسانوی مجموعے "چغد" میں شامل ہے۔ یہ افسانہ ایسا

افسانہ ہے کو خط کی تحریر کے انداز میں لکھا گیا۔ اسی طرح کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ پشاروایکسپریس میں شامل ان کا افسانہ "ایک طوائف کا خط" جو قائدِ اعظم اور نہرو کے نام لکھا گیا۔ اس خط میں تقسیم ہند کے بعد معاشرے پر اس تقسیم کے اثرات اور ایک ہندو یا مسلم لڑکی پر معاشرے میں ظلم و تشدد کو بیان کیا گیا ہے۔ خط کی تکنیک میں جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں انھیں پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہ تکنیک بے سود نہیں بلکہ اس تکنیک کے استعمال سے عمدہ افسانے لکھے گئے، لیکن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس تکنیک کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو پایا ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں یہ تکنیک کسی اہم تخلیق کار کے ہاتھوں لگی تو شہرت کی بلندیوں تک پر بھی پہنچ سکتی ہے کیوں کہ اس میں اچھا افسانہ لکھنے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ رشد الخیری، یلدرم، منٹو، کرشن چندر کے بعد انتظار حسین ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں مکتوباتی افسانہ لکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ ایسا افسانہ لکھنے کے لیے ایک بڑی اہم وجہ کہانی کا پلاٹ ہے، ایک ایسا خاندان جس کے بہت سے لوگ کسی بڑے سانحے سے گزرے ہوں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو، ہجرت کا سانحہ درپیش ہو، مرکزیت نہ ہو، ایک دوسرے سے میل ملاقات کی سہولیات ماسوائے خط و کتابت کے کچھ نظر نہ آرہی ہو اور باقی ایک خاندان کے اندرونی مسائل ہوں جن کا اظہار بڑے رازانہ انداز میں کرنا مقصود ہو۔ ڈاکٹر خالد ندیم لکھتے ہیں۔

> "اردو میں علامتی اور اساطیری افسانہ نگاری کے حوالے سے انتظار حسین (۱۹۲۵-۲۰۱۶ء) کو اولیت و انفرادیت حاصل ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے آئے، لیکن ان کی ہجرت ادھوری رہی، کیوں کہ انھوں نے جسمانی طور پر تو نقل مکانی کی، لیکن دل و دماغ وہیں چھوڑ آئے، چنانچہ وہ زندگی بھر ماضی کو یاد کرتے رہے "ہندوستان سے ایک خط" بھی ان کے اسی قسم کے جذبات سے عبارت ہے۔"(۲)

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان جیسی دو مملکتوں کی تشکیل سے جو معاشرہ وجود میں آیا اس کا رنگ روپ بیان کرنے والوں میں منٹو، کرشن چندر اور انتظار حسین کا نام بہت اہم ہے۔ پورا افسانہ ایک خط میں بیان کیا گیا ہے جس خط کا جواب ہی افسانے کا اختتام ہے۔ افسانے میں راوی چچا قربان علی ہیں جو پورے افسانے میں اپنی اسی شناخت واضح نہیں کرتے بلکہ ان کی باتوں سے خاندان کا ایک ہمدرد، وارث اور خونی رشتے کے جذبات واضح ہوتے رہتے ہیں۔ قربان علی کی باتوں سے متن کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بظاہر یہ کہانی پچیس چھبیس سالوں پر محیط ہے کیوں کہ قربان علی کا خط ۱۵/ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو لکھا گیا ہے اور پانچ ممالک کے اندر اس خاندان کے افراد بکھرے ہوئے ہیں اتنے واقعات کو نہایت عمدگی کے ساتھ ایک افسانے میں منتقل کر دینا آسان کام نہیں۔ یہ ایسی کہانی ہے کہ اگر خط کی تکنیک استعمال نہ کی جائے تو بہت طویل ہو جاتی۔

"ہندوستان سے ایک خط" میں ایک تکنیک فلیش بیک بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ خط ۱۵/ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں لکھا گیا اور موجودہ حالات پر بات ہو رہی ہوتی ہے کہ قربان علی تقسیم کے مہینہ سوا مہینہ بعد کے حالات بیان کرنے لگ جاتے ہیں کہ ایک بار عمران میاں تقسیم کے بعد ہندوستان آئے تھے اور ان کے حالات کس طرح کے تھے۔ اس کے بعد پھر حال سے ماضی میں چلے جاتے ہیں اور اپنے خاندان کے بارے میں گفت گو کرتے ہیں۔

> "احوال یہ ہے کہ عمران میاں ادھر سے گزرے تھے، جنگ کے دو سوا دو ماہ بعد کی بات ہے۔ یہ سمجھ لو کہ وہ گلابی جاڑا تھا، میں اپنا پلنگ کمرے سے دالان میں لے آیا تھا۔ رات گئے دستک ہوئی۔ میں پریشان ہوا کہ الٰہی خیر۔ اس غیر وقت میں کون آیا اور کیوں آیا۔ جا

کر دروازہ کھولا، دستک دینے والے کو سر سے پیر تک دیکھا، حیران و پریشان کہ یہ کون آ گیا ہے، خون نے خون کو پہچانا، ورنہ وہاں اب پہچاننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا، تب میں نے اسے گلے لگایا اور کہا کہ بیٹے ہم نے تمہیں ان حالوں تو پاکستان نہیں بھیجا تھا۔"(۳)

انتظار حسین کائنات کو ایک مخصوص اور مفرد انداز سے دیکھتے ہیں بعض اوقات وہ واحد متکلم راوی کا کردار اختیار کر کے اجتماعی تہذیب کی بازیافت کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے افسانوں میں تاریخی، تہذیبی فضا غالب نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ شخصی شناخت کو پہلو بھی کمزور نہیں ہونے دیتے۔ شخصی شناخت کا ایک اہم حوالہ مشترکہ خاندانی نظام ہے جو انسانی سماج میں ایک معتبر اور محفوظ طرزِ زندگی ہے۔ انتظار حسین کے ذہن میں ایک ایسا خاکہ ضرور ہے جس کا تعلق ان کے بچپن سے ہے اور پھر ہجرت کے بعد ان خاندانوں کا بکھرنا۔

"خاندان کی یادگاریں مع شجرہ نسب کے قبلہ بھائی صاحب اپنے ہمراہ ڈھاکہ لے گئے تھے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ہمارا شجرہ نسب گم ہو گیا۔ ہمارے اجداد نے کہ ساداتِ عظام میں سے تھے، تاریخ میں بہت مصائب و آلام دیکھے ہیں مگر شجرے کے گم ہونے کا الم ہمیں سہنا تھا۔ اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا ٹھکانہ اور شجرہ گم کر چکا ہے اور انتشار کا شکار ہے، کوئی ہندوستان میں کھیت ہوا، کوئی بنگلہ دیش میں گم ہوا اور کوئی پاکستان میں دربدر پھرتا ہے۔ عقیدے میں خلل پڑ چکا ہے۔ غیر اسلامی طور اطوار اپنا لیے ہیں۔ دوسرے مذہبوں اور فرقوں میں شادیاں کر رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو تھوڑے عرصے میں ہمارے خاندان کی اصل نسل بالکل ہی نابود ہو جائے گی اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔"(۴)

اس افسانے میں خاندان صرف ایک شخص کی پہچان ہی نہیں بلکہ تہذیب کے مہذب ہونے کا ایک استعارہ بھی ہے جہاں سے انسان کی اصل نسل اور جبلتی پہچان بھی جنم لیتی ہے۔ تقسیم کے واقعہ کے بعد بہت سے لوگوں پر بہت سارے امتحانات بھی تھے کہ جب لوگ افراتفری اور لالچ و حوس کا شکار ہوئے، بھوک اور غربت کو مٹانے کے لیے اپنی خاندانی روایایت سے منحرف ہوئے خاندانی اقدار کو بھول کر کیا سے کیا بن گئے، ایسے ایسے کام کیے جن سے باپ دادا کے ناموں پر حرف آیا۔ تو ایسے میں انتظار حسین کے ہاں خاندانی شناخت کا ایک سوال ابھرتا ہے کہ زمانے کی رفتار نے کیا دن دکھائے۔ اس افسانے میں ایک ایسا خاندان ہے جو سید ہے اور سادات کو ہمیشہ روایات واقدار کا پابند سمجھا جاتا ہے جہاں پر دین بھی ایک محفوظ صورت میں ملتا ہے۔ ہندوستان سے آیا یہ خاندان افتادِ وقت کے ہاتھوں یوں بکھرا کہ پانچ ممالک کی سماجی اقدار اس پر اثر انداز ہوئیں۔ ہر ملک کے عمرانی عوامل مختلف تھے جس باعث ایک متحد اور معتبر خاندان کے بچے بچیاں مختلف رسوم ورواج کو اپناتے نظر آتے اور خاندان کا ایک بزرگ اپنی آنکھوں سے خاندان کی اقدار کو اجڑتے بکھرتے دیکھ رہا ہے اور عمران میاں سے مختلف انداز میں اس کا ذکر کرتا نظر آتا ہے۔ خاندان کی لڑکیوں کا دوسرے خاندانوں میں شادیاں کرنا بھی سادات خاندان کے لیے موزوں عمل تصور نہیں کیا جاتا اور عورتوں کا خریداری کے لیے بازار جانا دکانداروں سے

بھاؤ پر جھگڑنا بہت غیر موزوں عمل ہے۔ افسانے میں وہ منظر جب ان کی چھت پر ایک کنکوہ پھینکا جاتا ہے تو لڑکی کی شادی فوراً کر دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے، مگر نکاح کے وقت شعیہ سنی کا مسئلہ درپیش آجاتا ہے تو اس منظر کو یوں بیان کیا جاتا ہے۔

"رضا علی صاحب تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس گھر کی بیٹی ان کی بہو بنے گی۔ ترت نکاح پر رضا مند ہو گئے مگر عین وقت پر سوال اٹھایا کہ صیغا پڑھایا جائے گا میاں جانی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے مگر کیا کرتے، ہاں کر دی، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ خدیجہ کی اولاد آدھی تیتر آدھی بٹیر ہے۔ ایک گیارہویں شریف کی نیاز دلاتا ہے تو دوسرا محرم میں عزاداری کرتا ہے، مگر خیر اب تو ہمارا آدھا خاندان ہی آدھا تیتر آدھا بٹیر ہے اور ہم سب عزادار ہیں کہ شجرہ ہمارا کھو گیا اور اصل نسل کا اتا پتا غارت ہوا۔ خاندانوں میں یہ خاندان آگے کیسے پہچانا جائے گا۔ اب یہ خاندان کوئے کو ہے، درخت سے جھڑے ہوئے پتے ہیں کہ ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں اور خاک میں رلتے ملتے ہیں۔"(۵)

ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ انتظار حسین نے تقسیم کے بعد جن خاندانوں میں بُری اقدار بد عنوانی اور بد اخلاقی دیکھی تو اس کے پس منظر میں اس کے خاندان کی طرف جھانکنے کی بھی ضرور کوشش کی ہے۔ کیوں کہ افسانے میں ایک خاندان کی شرافت اور عظمت کے لیے اس کا صاحبِ شجرہ ہونا بہت اہم ہے۔ شجرہ ایک ایسی مقدس دستاویز ہے جو خاندان کی مشترکہ وراثت ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان کے رفتگاں کا دیا ہوا ایک عظیم تحفہ بھی ہے جس کی حفاظت کرداروں کے رہن سہن سے اور رسم ورواج سے ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب میں باقاعدہ ایک ایسا عہد گزرا ہے جس میں انسان کی اصل نسل اور پہچان کے لیے اس کے خاندان کو اہم اور معتبر حوالہ تصور کیا جاتا ہے رہا ہے اگرچہ موجودہ دور میں اس کا رواج کچھ کم ہو گیا ہے لیکن ماضی قریب میں شجرہ اور خاندان کی اہمیت کو کم اہم تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ رشتوں کے لین دین میں باقاعدہ ایسے مضبوط حافظے والے اشخاص سے مدد لی جاتی تھی جو مختلف خاندانوں کے حسب نسب کو جانتے ہوتے تھے اوران کا ریکارڈ درست رکھتے تھے۔ یوں خاندان کا ہر شخص خاندان کی عزت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اردو فکشن کی روایت میں تقسیم کے حالات ملتے ہیں اور ان حالات میں جن لوگوں نے مختلف ممالک سے حاصل ہونے والی مالی امداد اوراشیاد خوردونوش پر جس طرح ہاتھ صاف کیا، محکمہ اوقاف کے لوگ کس طرح راتوں راتوں امیر ہوئے یہ سب بتانے کے لیے انتظار حسین نے بھی اس افسانے میں ایک بہت خوبصورت قرینہ استعمال کیا اور کچھ لوگ جو چچا قربان علی کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان میں لفنگے تھے وہ بھی پاکستان آکر ملوں اور کمپنیوں کے مالک بن گئے۔ یہ قربان علی کے نزدیک یقیناً ایسا عوامل ہیں جن کی وجہ سے ان کے خاندانوں پر حرف آتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تقسیم کے بعد سب کا شجرہ گم ہو گیا؟؟؟

"ہاں میاں! شجرہ تو کھو گیا اب یہ خاندان جو بھی کرے تھوڑا ہے، مگر سنتا ہوں کہ دوسرے خاندانوں والے اس سے بڑھ کر کر رہے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ابراہیم نے آٹے میں چوری اور چربی پیس پیس کر ایک اور مل بنالی ہے اور میاں فیض الدین نے کہ یہاں پھٹے حالوں پھرتے تھے کالے پیسے سے کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا پاکستان میں سب ہی خاندانوں کے شجرے کھو گئے؟(۶)

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا اس عمل سے دو ملک تو وجود میں آ گئے مگر بہت سے مسائل پیدا ہوئے جن میں رشتوں کا الگ الگ ہو جانا زمینوں کی تقسیم، مکانات کی تقسیم، کچھ مکانوں کے مالک ملک چھوڑ گئے تو ان مکانوں کی از سرِ نو الاٹ منٹ یا پھر دور کے رشتہ داروں کا حق دعویٰ وغیرہ یہ سب ایسے معاملات ہیں جن کی بابت محکمہ اوقاف کے کلرکوں اور کچہری کے وکیلوں منشیوں کی آمدنی میں خوب اضافہ ہوا، دوسری طرف شریف اور سادہ لوح انسانوں کے روز کے چکر لگتے تاریخیں پڑتیں اور ذلیل ہونے کے بعد وہ گھر واپس لوٹتے۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے متنازعہ مکانوں کی مرمت کے کام بھی غیر دلچسپی اور مالکانہ حقوق کی عدم دستیابی کے باعث ادھورے رہ گئے۔ ایسی ہی کچھ حقیقت اس خط میں بھی چچا قربان علی اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

> "دیوان خانے کا حال تو یہ ہے کہ چھت کی طرف دیکھو تو آسمان نظر آتا ہے۔ ہماری بیکاری اور زیر باری کا حال تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم کچھ رقم بھیج سکو تو میاں جانی کی قبر کی مرمت کرا دی جائے اور دیوان خانے کی چھت پر مٹی ڈلوائی جائے۔ اس سے زیادہ فی الحال کرنا بھی نہیں چاہیے۔ حویلی کے مقدمے کے کاغذات میرے سپرد کر گئے تھے، الحمد للہ! اس وقت سے اب تک میں نے سب پیشیاں کامیابی سے بھگتائی ہیں اور ہمیشہ لائق وکیلوں سے رجوع کیا خدا کی ذات سے امید ہے کہ مقدمے کا فیصلہ جلدی ہو گا اور ہمارے حق میں ہو گا، مگر پیکِ اجل کا پتہ نہیں کس روز سر پہ آ کھڑا ہو، کبھی کبھی بہت فکر مند ہوتا ہوں کہ میرے بعد یہ مقدمہ کون لڑے گا؟"(۷)

اس افسانے میں ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اس میں تقسیم کے حالات کا بیان تو ملتا ہے لیکن اصل میں یہ افسانہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کے دنوں میں لکھا گیا ہے اور اس میں زیادہ تر واقعات اس زمانے کے ملتے ہیں۔ ۳۰/جون ۱۹۷۴ء کو قادیانوں کو غیر مسلم قرار دیا جاتا ہے جس کے بارے میں قربان علی بتاتے ہیں کہ میں نے یہ خوش خبری شیخ صاحب کو سنائی تو بہت خوش ہوئے اور پاکستان کو دعا دی اور اپنی بے بسی پر اظہارِ افسوس کیا کہ ہمارے قریب ہی انھوں نے مسجد بنالی اور وہ آمین کہتے ہیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ اس افسانے کے بارے میں انتظار حسین خود ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:۔

> اقبال:۔ تکمیل کے سمے کیا احساس تھا کہ جس المیے کی چاپ سن کر لکھنا شروع کیا، لکھت کے دوران ہی وہ دہلیز پر آ گیا؟
>
> انتظار حسین:۔ ناول کی شکل تو اسی وقت بنی۔ ایک زمانے میں تو میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ سن ۷۴ء کی فضا دوبارہ زندہ ہو گئی تو پھر لکھنا شروع کیا۔ جب یہ واقعہ گزر گیا تو میں نے فوری طور پر دو تین کہانیاں "شہر افسوس"، "اندھی گلی"، "ہندوستان سے ایک خط" لکھیں۔ اسی رو میں یہ ناول لکھا گیا۔ تو یہ کہانیاں اور "بستی" ایک طریقے سے سانحہ مشرقی پاکستان کا سوگ ہیں"(۸)

یہ کہانی مشرقی پاکستان کے سوگ میں تو لکھی گئی لیکن اس میں مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات اور اس المیہ کے اسباب پر کوئی بات نہیں کی گئی۔ قربان علی اور اس کے بھتیجے عمران میاں کے درمیان ہونے والی گفت گو میں ہندوستان اور پاکستان کے حالات شامل ہیں۔ یعنی انتظار حسین کا سروکار زیادہ تر اس سانحے سے ہے جس سے وہ براہ راست گزرے ہیں متخیلہ کی مدد سے انھوں نے

مشرقی پاکستان کے حالات کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر پاکستان کے حالات پر بات کی ہے۔ یہ کہانی دراصل ایسے خاندان کی کہانی ہے جو ہندوستان میں قیام پذیر تھا اور یہ خاندان پانچ ممالک میں تقسیم ہو گیا جس کا سوگ مشرقی پاکستان کے سانحہ کے وقت کیا جارہا ہے۔ انتظار حسین کے حافظے میں کئی شکلیں ہیں جو لمحوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور کئی لمحے ہیں جو مختلف شکلوں کے حجم سے اپنی تکمیل پاتے ہیں۔ گھر، گلیاں، کوچے، شخص، چہرے، آوازیں ان لمحوں کے تعاقب میں ہیں جو وقت کی زد میں آکر ہم سے دور ہو گئے۔

اس افسانے میں قربان علی ہندوستان کی سرزمین پر ایک ایسا کردار ہے جس کے پاس ماضی ہے، یادیں ہیں، خواب ہے ایک مکمل خاندان کا تصور ہے، خاندانی اقدار ہیں، شرافت ہے تہذیب ہے۔ ہندوستان تقسیم ہوا ہجرت کا المیہ ہوا اس کے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سے زیادہ کاری ضرب اس کے خاندان کے شجرے پر پڑی۔ اس شخص کی خاندانی اقدار کو زوال آچکا ہے اور وہ اپنے آنے والی نسلوں کے خدوخال ضابطہ تحریر میں لانا چاہتا ہے تا اس کے خاندان کا شجرہ مزید بڑھے اور محفوظ رہے یہ بھی پتہ چلے کہ آنے والی نسل میں کون کون اپنے اصلاف میں کس کس پر گیا ہے تقسیم کے بعد اس کا ناک نقشے میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ یہ کیسا احساس ہے جس کا سارا بوجھ ایک ضعیف حافظے پر چھایا ہوا ہے۔ وہ یہ بوجھ اتارنے کے لیے بھتیجے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے، جس کی طرف سے خیر خیریت کی کوئی خبر بھی اسے موصول نہیں ہو رہی اور وہ اپنے خاندان کے شجرے کا بوجھ بھی اسے سونپنا چاہتا ہے۔ حکومتوں کے آپسی تعلقات لین دین تجارت سیاست یہ سب اس کے خاندانی شجرے سے بڑی نہیں ہیں۔ محمد عمر میمن اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "چنانچہ یاد کرنے کے معنی ہیں اپنی ذات کے اجزائے ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنا اور شیرازہ بندی کے نتیجے میں حاصل شدہ اس ذات کو ایک ناقابلِ تردید استناد، ایک تہذیبی انفرادیت کا وقار بخشنا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی عمل میں انتظار حسین "ماضی" کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے ہیں۔" (۹)

انتظار حسین ہندوستان سے لاہور میں آباد ہوئے، ان کے افسانوں میں شامل ان کی یادیں اور ماضی کی طرف بار بار لوٹنا اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اجنبی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ وہ ماضی کی یادوں کے حصار سے کبھی باہر نہیں نکل پائے۔ انتظار حسین کے ماضی میں مذہب، تاریخ، تہذیب، بستیاں، حکایتیں اور داستانیں، توہمات سب کچھ شامل ہے۔ ان تلازموں سے ان کے ہاں ماضی کی ایک ایسی ٹیس ابھرتی ہے جو ایک المیہ کی صورت میں قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنا دراصل اپنے آپ کو یاد کرنے کے مترادف ہے۔ یہ افسانہ محض افسانہ نہیں بلکہ ان کی ہجرت کہانی ہے، لیکن اس میں ناسٹلیجیا افسانہ نگار کا نہیں بلکہ وہ ایک کردار کو ہجرت کے تجربے سے گزارتا ہے یعنی قربان علی براہ راست خود ہجرت نہیں کرتا بلکہ اس کا خاندان اصفہان سے اُٹھ کر ہندوستان آیا۔ اس کردار کے آباواجداد ہجرت کے کرب سے گزرے۔ پورے خاندان کا ناسٹلیجیا ایک بوڑھے شخص کو وراثت میں ملا خاندان کے لوگوں کے مارے جانے سے زیادہ دکھ اسے اپنے خاندان کے شجرے کے گم ہونے کا ہے وہ اپنی نسل کا، نسل کا اقدار کا اکیلا محافظ ہے۔ یہ کردار مہاجر نہیں لیکن ہجرت کا المیہ اس کی نسل کے بکھر جانے کی صورت میں صاف نظر آتا ہے

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، ہندوستان سے ایک خط (افسانہ)، مشمولہ، کچھوئے، لاہور، مطبوعات ۱۹۸۱ء، ص:۵۷

۲۔ خالد ندیم، ڈاکٹر، ندرتِ خیال، لاہور، ادارہ نشریات، فروری ۲۰۲۳ء، ص:۴۴

۳۔ انتظار حسین، ہندوستان سے ایک خط (افسانہ)، ص:۵۶،۵۵

۴۔ ایضاً، ص:۵۷

۵۔ ایضاً، ص:۶۵،۶۴

۶۔ ایضاً، ص:۶۶

۷۔ ایضاً،:۵۶

۸۔ اقبال خورشید، لکھا تو کہانی بن گئی، (عہد ساز فکشن نگار انتظار حسین سے خصوصی مکالمہ)"، مشمولہ، "عالمی اردو ادب" (انتظار حسین نمبر)، دہلی، س ن، ص:۳۹

۹۔ محمد عمر میمن، حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت، (مشمولہ)، "سویرا"، خاص شمارہ، لاہور، نیا ادارہ، مئی ۱۹۷۶ء، ص:۴۵

References in Roman Script:

1. Intizar Husain, "Hindustan Se Ek Khat" (Afsana), Mashmoola: Kachhuay, Lahore: Matbu'at, 1981, p. 57.
2. Dr. Khalid Nadeem, "Nudrat-e-Khayal", Lahore: Idara Nashriyat, February 2023, p. 44.
3. Intizar Husain, "Hindustan Se Ek Khat" (Afsana), pp. 55–56.
4. Ibid., p. 57.
5. Ibid., pp. 64–65.
6. Ibid., p. 66.
7. Ibid., p. 56.
8. Iqbal Khurshid, "Likha To Kahani Ban Gayi (Ahd-Saz Fiction Nigar Intizar Husain Se Khusoosi Mukalama)", Mashmoola: Aalami Urdu Adab (Intizar Husain Number), Delhi: S.N., p. 39.
9. Muhammad Umar Memon, "Hafizay Ki Bazyafat, Zawal aur Shakhsiyat Ki Maut", Mashmoola: Savera (Khas Shumara), Lahore: Naya Idara, May 1976, p. 45.